وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں درجہ ثانیہ تا درجہ خامسہ

ترجمۂ قرآن اور تفسیر کیسے پڑھائیں؟

مولانا عمران عیسیٰ
استاذِ جامعہ

’’زیرِنظر مضمون جامعہ کے استاذ مولانا عمران عیسیٰ صاحب کی طرف سے وفاق المدارس کے ’’تدریب المعلمین‘‘ کے کراچی میں منعقد ہونے والے اجتماع مؤرخہ ۱۳ اور ۱۴ جون ۲۰۲۳ء میں پیش کردہ مقالہ یا بیان ہے، ضروری ترمیم کے بعد افادۂ قارئین کے لیے پیشِ خدمت ہے۔ بیان کی ریکارڈنگ کو تحریری شکل دی گئی ہے، چوں کہ تقریر وتحریر کے اسلوب میں نمایاں فرق ہوتا ہے، اس لیے اُمید ہے کہ اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔‘‘

قابلِ احترام اکابر اساتذۂ کرام! آپ حضرات مختلف مدارس سے تشریف لائے ہیں، میں آپ کے سامنے بات کرنے کے لیے بیٹھا ضرور ہوں، لیکن مجھے آپ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، میں آپ کا ساتھی ہوں، آپ سے ادنیٰ ہوں، علم میں بھی، عمل میں بھی، لیکن بعض دفعہ چھوٹوں سے اُن کی تربیت کے لیے کام کرایا جاتا ہے اور بعض دفعہ چھوٹے بڑوں کو سبق سنایا کرتے ہیں، تاکہ غلطیوں کی اصلاح ہوجائے تو اس لیے میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں، اور اگر کوئی غلط بات منہ سے نکل جائے تو امید ہے کہ آپ حضرات درگزر بھی فرمادیں گے۔
وفاق المدارس کے تحت ’’تدریب المعلمین‘‘ کے اس اجتماع میں اس مجلس سے پہلے اور بعد میں بھی آپ کو اکابر کی بات سننا نصیب ہوگی، درمیان میں اس نشست پر گزارا کرلیں، لیکن اتنی بات ہے کہ کوئی اجتہادی بات یا کوئی اِبداع نہیں ہوگا، بلکہ جو بات بڑوں سے سنی ہے وہی آپ کی خدمت میں عرض کردی جائے گی اور اس میں بھی کوئی غلطی ہو تو آپ اصلاح فرماسکتے ہیں۔ سننِ ابی داوٗد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’تَسْمَعُوْنَ وَ یُسْمَعُ مِنْکُمْ وَ یُسْمَعُ مِمَّنْ یَسْمَعُ مِنْکُمْ‘‘ تم مجھ سے دین حاصل کررہے ہو، پڑھ رہے ہو، آئندہ زمانے میں تم سے سنا جائے گا، لوگ تم سے استفادہ کریں

گے، پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جنہوں نے تم سے استفادہ کیا ہوگا وہ لوگوں کو سنا رہے ہوں گے۔ تو یہ علم سینہ بسینہ، کابرًا عن کابرٍ منتقل ہوتا ہے، اس لیے جو کتابوں میں پڑھا، جو اساتذہ سے سنا، وہ آپ کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کر دی جائیں گی۔ میرے ذمے جو موضوع ہے وہ ''ترجمۂ قرآن اور تفسیر'' ہے۔

ہمارے ہاں درسِ نظامی میں درجہ ثانیہ سے ترجمۂ قرآن شروع ہوتا ہے، درجہ ثانیہ میں پارہ عم پڑھایا جاتا ہے، پھر درجہ ثالثہ، درجہ رابعہ اور درجہ خامسہ کے تین سالوں میں دس، دس پارے کر کے پورا قرآن مکمل کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد درجہ سادسہ میں ''تفسیرِ جلالین'' ہے اور پھر درجہ سابعہ میں ہمارے ہاں ''تفسیرِ بیضاوی'' ہے، جس کا ''الٓمٓ'' کا ایک پاؤ پڑھا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے۔

جو ترجمۂ قرآن، درجہ ثانیہ سے درجہ ثالثہ تک، یا درجہ ثانیہ سے درجہ رابعہ تک ہے، اُس میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ وہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، مگر پہلے کچھ تمہیدی باتیں عرض کرنی ہیں۔

ترجمۂ قرآن پڑھانے والا اپنی نیت کو صاف اور جذبہ کو تازہ کرے

پہلی تمہیدی بات تو یہ ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ریاضُ الصالحین'' میں محدثین کی عادت کے مطابق اخلاص، یا ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' والی روایت سے کتاب کو شروع کیا ہے، اس پر عنوان یا ترجمۃ الباب انہوں نے یہ قائم کیا ہے: ''بابُ الإخلاص واستحضار النيّة فيه'' یعنی عمل میں اخلاص پیدا کرنا اور جو عمل کر رہے ہیں، اس عمل کرتے وقت اپنے آپ کو یاد دلانا کہ میں کونسا عمل کر رہا ہوں، یہ وہ بات ہے جس کو ''احتساب'' کہا جاتا ہے، گویا عمل کرتے وقت اپنے آپ کو یاد دلانا کہ میں کونسا عمل کر رہا ہوں، اس لیے ''حیاۃُ الصحابۃؓ'' میں مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے: ''لَا أَجْرَ لِمَنْ لَّا حِسْبَةَ لَهٗ''، اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا جس کو نیکی کرتے وقت یہ یاد نہ ہو کہ میں کیا عمل کر رہا ہوں۔ ''احتساب'' یہ ہے کہ عمل کی اہمیت دل میں ہو، دل میں یہ بات نہ ہو کہ مہتمم صاحب نے مجھے ''هدايةُ النحو'' نہیں دی، ''عمّ پارہ'' دے دیا، مجھے ''كنز الدقائق'' حوالہ نہیں ہوئی، جو فن کی کتاب کہلاتی ہے، ''شرح التهذيب'' حوالے نہیں ہوئی، یہ میری ناقدری ہوئی کہ مجھے ''ترجمۂ قرآن'' پڑھانے کو ملا، تو یہ ناقدری نہیں ہے میرے دوستو! مجھے بہت بڑی سعادت ملی کہ مجھے قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھانا نصیب ہوا۔

طلباء ہمارے پاس نعمت بھی ہیں، امانت بھی ہیں، ان کی قدر کی جائے

دوسری بات جو مجھے آپ سے عرض کرنی ہے، ویسے وہ بھی عمومی سی ہے، وہ یہ ہے کہ ابھی حضرت مولانا امداد اللہ صاحب سے بھی آپ نے اس طرح کی بات سنی، اور ہم نے سنا ہے کہ دار العلوم دیوبند میں جو داخلہ فارم

جاری ہوتا ہے اس کے اوپر ایک روایت لکھی ہوئی ہے: ''إِنَّ النَّاسَ لَکُمْ تَبَعٌ، وَإِنَّ النَّاسَ یَأْتُوْنَکُمْ مِنْ أَقْطَارِ الْأَرْضِ یَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّیْنِ، فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَیْرًا'' لوگو! تمہارے پاس لوگ آئیں گے، دین سیکھنے کے لیے (ان کی قدر کرنا) اور ان کا خیال رکھنا۔ اس لیے حضرت صدرِ وفاق شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی یہ بات کہیں سنی یا پڑھی کہ ''طلبہ ہمارے پاس نعمت بھی ہیں، امانت بھی ہیں۔'' آپ میں سے بہت سارے دوست جمعہ پڑھاتے ہوں گے، خطباء ہوں گے، جمعہ کا مجمع بیان سننے کے لیے کتنا آتا ہے، (یہ ہم جانتے ہیں) جبکہ یہ طلبہ کتنے ادب کے ساتھ ہمارے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں؟! اور پھر بفضلہٖ تعالیٰ مدارس کی رونقیں روز افزوں بڑھ رہی ہیں۔

مطالعہ وتیاری کا اہتمام

تیسری تمہیدی بات یہ کہ ہم کتاب کوئی بھی پڑھائیں، تو مطالعہ کا خوب اہتمام ہو، جب میرا تدریس کا دوسرا سال تھا تو مجھے ''کنز الدقائق'' حوالے ہوئی، استاذِ محترم (سارے ہی اساتذہ ہمارے محسن ہیں، لیکن بعض اعتبار سے) مفتی محمد ولی درویش صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت خیال فرمایا، انہوں نے مجھ سے فرمایا: درجہ اولیٰ سے لے کر درجہ رابعہ تک ہمارے درسِ نظامی میں فقہ کی جتنی کتابیں ہیں ان سب کو دیکھنا ہے، جو سبق پڑھاؤ اس سے متعلق ''مختصر القدوري'' بھی دیکھو، ''کنزُ الدقائق'' تو دیکھو، اس جگہ پر ''شرح الوقایة'' بھی دیکھو، اس جگہ پر ''هدایة'' بھی دیکھو اور ''کنزُ الدقائق'' کی ساری شروحات دیکھو۔'' پھر فرمانے لگے: ''جو مطالعہ کرو وہ سب طلبہ کو نہیں بتانا، بلکہ خود کو مسلح کرنا ہے، یعنی پوری طرح تیار ہو کر جانا ہے، کوئی پتہ نہیں طالبِ علم کیا سوال پوچھ لے۔''

اور آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا، اس مجلس میں پرانے مدرسین بھی بیٹھے ہیں کہ جب مطالعہ مضبوط ہوتا ہے تو سبق میں بڑی برکت ہوتی ہے، ہم کبھی بعض اساتذہ کا سوچتے ہیں کہ ان کا سبق کتنا برکت والا ہوتا ہے، وہ برکت والا اس لیے ہوتا ہے کہ ان کی نیکی اور روحانیت تو اپنی جگہ پر، ان کا علم پر اتقان اور دَرک ہوتا ہے جو سبق میں برکت پیدا کر دیتا ہے، تو ترجمۂ قرآن کے لیے بھی ہمیں بہت اچھی طرح مطالعہ کرنا ہوگا۔

ترجمۂ قرآن وتفسیر کی تدریس کے دوران کن تفاسیر کو مطالعہ میں رکھیں؟

''یتیمةُ البیان'' میں محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات لکھی ہے کہ چار تفاسیر ایسی ہیں کہ اگر ان کا اہتمام سے مطالعہ کر لیا جائے تو فی الجملہ کہا جا سکتا ہے کہ دیگر تفاسیر سے ایک گونہ استغناء ہو جائے، اور انہوں نے اس کی ایک مثال دی، جیسے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی ''فتحُ الباري'' اگر پڑھ لیں تو ''صحیح بخاری'' پڑھانے والے کو ایک گونہ اس میں ''صحیح بخاری'' کی دیگر شروحات سے استغناء ہو جاتا

ہے۔انہوں نے جن چار تفاسیر کا لکھا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

❶-روح المعانی ❷-تفسیرِ کبیر ❸-تفسیر ابنِ کثیر

❹-تفسیرِ ابی السعود

البتہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ''علومُ القرآن'' میں اس میں تفسیر قرطبی کا اضافہ کیا ہے، اور یہ بھی لکھا کہ ''یتیمۃُ البیان'' میں حضرت بنوریؒ کی اس بات پر نظر پڑی، تو لکھا کہ ''مجھے خوشی ہوئی کہ میری بات کی تائید ہوگئی۔''

پھر ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مضبوط مطالعہ کے بغیر طلبہ بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ پچیس، تیس سال پہلے چلے جائیں تو طلباء عام طور پر عقیدت کی چادر اوڑھ کر سبق میں بیٹھتے تھے، اب طلبہ بہت ہوشیار ہیں، ہمارے مطالعہ کا نقص ان کو پتہ چل جاتا ہے، وہ یہ بھی جانچ رہے ہوتے ہیں کہ آج استاذ صاحب جو تھوڑی دائیں بائیں کی باتیں کر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس لیے ہمیں بہت اچھی طرح محنت کر کے پڑھانا ہوگا۔

کسی بھی کتاب میں دلچسپی کے لیے اس سے مناسبت اور ذوق ہونا ضروری ہے

چوتھی تمہیدی بات یہ ہے کہ کوئی بھی کتاب پڑھانے میں دلچسپی اس وقت ہوتی ہے جب اس کتاب سے مناسبت اور ذوق پیدا ہو جائے، اگر ذوق نہیں ہوگا تو طبیعت چلے گی نہیں، مطالعہ کرنے کے لیے دھکا دینا پڑے گا اور سال کے بیچ میں بھی کوشش کریں گے کہ کتاب بدل جائے، ورنہ اگلے سال تو ضرور کوشش کریں گے۔ بہت کم قسمتی ہوگی اگر ترجمۂ قرآن میں یہ کیفیت پیدا ہو، اس لیے اس کو اللہ سے مانگنا بھی پڑے گا اور ایسی کتب کا مطالعہ کرنا ہوگا جن سے ہمارا ذوق جوان ہو، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''میری علمی اور مطالعاتی زندگی'' میں لکھا ہے اور کہیں اور بھی میں نے پڑھا تھا، ایک دفعہ اگر قرآن کے ساتھ طبیعت لگ جائے نا تو پھر بہت ساری دیگر تصنیفات اور دیگر فنون میں طبیعت نہیں چلے گی، بس ایک دفعہ تیلی جلنے کی دیر ہے اور ایک دفعہ چولہا جلنے کی دیر ہے، پھر ہماری طبیعت چل جائے گی۔

یہ کچھ تمہیدی اور اصولی باتیں میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیں، اب متعلقہ موضوع کے بارے میں عرض کرتا ہوں:

① مقدمۃ العلم سے آگاہی

مدرس کوئی بھی فن پڑھائے، اس کو اس فن سے متعلق ابتدائی باتیں جس کو مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کہا جاتا ہے، اس کا علم ضروری ہے۔ آپ ترجمۂ قرآن کو لے لیں، تو اس سے متعلق جو تمہیدی اور مقدمۃ العلم کی باتیں ہیں، وہ ہمیں علی بصیرۃٍ پتہ ہونی چاہئیں، ممکن ہے کہ درجہ ثانیہ میں بتانے اور بیان کی نوبت نہ

آئے، لیکن ہمیں پوری طرح اس کا دَرک ہونا چاہیے، جمعِ قرآن، تاریخِ علمِ تفسیر، اہم تفاسیر اور ان کا منہج، تفسیر کے ماٰخذ، اس سے متعلق ہمیں ضرور آگاہی ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ہمارے سامنے کتب ہیں، اردو میں بھی مواد مل جائے گا، ابھی میں نے نام لیا ''علومُ القرآن'' حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا، ایک ''علومُ القرآن'' مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، بعض دفعہ ناموں میں اشتباہ ہوجاتا ہے اور خیال گزرتا ہے کہ دونوں کے مضامین ایک ہیں، ایسا نہیں ہے، بعض خاصے کی چیزیں مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''علومُ القرآن'' میں آپ کو ملیں گی۔ مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازی کے ''محاضرات'' کئی علوم پر ہیں، آپ نے پڑھے ہوں گے، ان میں ''محاضراتِ قرآنی'' بھی ہیں جو ان کے اسلام آباد میں دیے ہوئے لیکچرز ہیں، وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوبارہ یاددہانی کرادوں کہ مدرس کا مطالعہ کبھی اس بنیاد پر نہیں ہوگا کہ مجھے کل سبق میں بتانا کیا ہے؟ بلکہ میرا مطالعہ سو فیصد ہوگا، بے شک اس میں سے دس فیصد باتیں بتانی ہیں۔

۲: ترجمۂ قرآن

درجہ ثانیہ سے درجہ خامسہ تک ہمارا جو سبق ہے، اس میں بڑا عنوان ''ترجمہ'' ہے۔ تفسیر بیان تو کی جاتی ہے، لیکن اصل جو مطلوب ہے وہ ترجمہ ہے، اگر یہ ذہن میں نہ ہو تو بعض دفعہ آپ جانتے ہیں کہ مدارس میں جو جدول اور تقسیمِ اسباق کا نقشہ لگتا ہے اس میں بھی لکھ دیا جاتا ہے: ''تفسیر''، لیکن اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ طالبِ علم ہو یا استاذ ہو، ترجمہ کی وہ اہمیت ذہن میں نہیں رہتی، ہمارا اصل مطمحِ نظر ترجمہ ہے، اگر یہ ترجمہ ہمارے قابو میں نہ آیا اور ہم نے درسِ قرآن کے انداز میں، یا بیان کے انداز میں تفسیر کردی، تو ہم پورا مقصد ادا نہیں کررہے۔

ترجمہ کی تین نوعیتیں

ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات اگر آپ پڑھیں گے اس میں بہت تفصیل سے یہ بات لکھی ہے، ترجمے تین طرح کے ہوسکتے ہیں، ایک ''تحت اللفظ ترجمہ''، دوسرا ''سلیس ترجمہ'' اور تیسرا ''بامحاورہ ترجمہ''، اب تینوں ترجموں میں کیا فرق ہے؟ یہ بتانے کا ابھی موقع بھی نہیں ہے، لیکن بتانے کی بات ابھی یہ ہے کہ درجہ ثانیہ سے لے کر درجہ خامسہ تک اصل تو ''تحت اللفظ ترجمہ'' اور ''سلیس ترجمہ'' ہے۔ جبکہ ''بامحاورہ ترجمہ'' بعض جگہوں پر تو کرنا پڑے گا جہاں آیت مشکل ہوگی اور اس کے بغیر سمجھ میں نہ آرہا ہو، جیسے مساجد میں درسِ قرآن میں آپ حضرات کا واسطہ رہتا ہوگا، لیکن طلبہ کو ہمیں آیت سے مناسبت پیدا کرانی ہے تو ہمیں ''تحت اللفظ ترجمہ'' بھی کرنا ہے، تاکہ ان کو ''مفردات'' کا ترجمہ آجائے، اور ''سلیس ترجمہ'' بھی اس لیے ہو کہ اولیٰ سے رابعہ تک طلبہ صرف ونحو کی کتابیں پڑھ رہے ہوتے ہیں، تو اس کو ترکیبی لحاظ سے بھی جملہ سمجھ میں آرہا ہونا چاہیے کہ کہاں ''فاعل'' آیا؟ کہاں ''مفعول'' آیا، کہاں ''مرکب'' مکمل ہوا؟ کہاں ''مبتدا''؟ کہاں ''خبر''؟ کہاں ''جملہ معترضہ''؟ کہاں

’’جملہ حالیہ‘‘؟ اور کبھی حسبِ ضرورت بامحاورہ ترجمہ بھی، جیسے کہیں محاورہ آ گیا، مثلاً ’’وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ أَيۡدِيهِمۡ وَرَأَوۡاْ أَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّواْ قَالُواْ ...إلی آخر الآیة‘‘ اس میں ’’وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ أَيۡدِيهِمۡ ‘‘، یہ ٹھیٹھ محاورہ ہے عربی کا، اب یہاں بامحاورہ ترجمہ کیے بغیر طلبہ کی تشنگی دور نہ ہوگی۔

تو خلاصہ یہ کہ اصل ’’تحت اللفظ ترجمہ‘‘ ہے اور اس کے ساتھ ’’سلیس ترجمہ‘‘ ہے اور حسبِ موقع ’’بامحاورہ ترجمہ‘‘ کرنا ہے۔ سلیس ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کا فرق آپ کو محاضراتِ قرآنی میں بھی مل جائے گا۔

ترجمہ کے لیے معاون کتب

’’تحت اللفظ ترجمہ‘‘ کے لیے اساس تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ ’’بیانُ القرآن‘‘، ’’معارفُ القرآن‘‘ کی ’’خلاصۂ تفسیر‘‘ کو جمع کرلیا تو ترجمہ پر گرفت حاصل ہوجائے گی۔

اجتہادی ترجمہ کرنے سے گریز کیا جائے

یہاں ایک بات عرض کرنی ہے، وہ آگے ’’تفسیر‘‘ میں بھی کام آئے گی، لیکن ایسا نہ ہو کہ آگے رہ جائے تو ابھی عرض کردیتا ہوں، ہم نے دیکھا کہ اکابر ترجمہ میں احتیاط اتنی کرتے ہیں کہ بڑوں کے ترجمے سے سرِمو انحراف نہیں کرتے، کوشش یہ کی جائے کہ ترجمہ اجتہادی نہ ہو، مثلاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی فضائلِ اعمال میں جہاں جہاں آیت آئی تو ’’بیانُ القرآن‘‘ کے ترجمہ سے ہٹے نہیں، اس لیے ہمیں ’’ترجمہ‘‘ میں کوئی ایسی تعبیر اختیار نہیں کرنی جو صرف ذاتی ذوق کی عکاس ہو، یہ امانت کا معاملہ ہے، عام عبارات میں ہم اپنی تعبیر شاید کرپائیں، قرآنِ پاک میں نہیں کرسکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کتنے بڑے آدمی ہیں؟! ’’أعلمُ الصحابة‘‘، ان سے ایک آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نہیں جانتا، پوچھنے والے نے تعجب سے عرض کیا: آپ نہیں جانتے؟! اس پر فرمایا: ’’أَيُّ أرْضٍ تُقِلُّنِيْ وَ أَيُّ سَمَاءٍ تُضِلُّنِيْ إِذَا أَنَا قُلْتُ فِي الْقُرْآنِ مَا لَا أَعْلَمُ . أو کما قال‘‘، مجھے کونسی زمین اور کونسا آسمان پناہ دے گا اگر قرآن میں، میں نے اپنی طرف سے لب کشائی کی، یہ کون کہہ رہا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں، ان سے زیادہ بھلا کون قرآن کو جانتا ہوگا؟!

③ حلِ مفردات

ہمارا ترجمہ حل نہیں ہوگا جب تک کہ ہم ’’مفردات‘‘ طلباء سے حل نہ کرالیں، طلباء کو صیغوں کی پہچان نہ ہو، ابھی حضرت مولانا امداداللہ صاحب فرمارہے تھے کہ میں دورۂ حدیث والوں سے دعائے قنوت سنتا ہوں اور سنتا صرف نہیں ہوں بلکہ پوچھتا ہوں کہ یہ صیغہ کونسا ہے؟ ’’حلِ مفردات‘‘ کے تین جزء ہیں: لغوی معنی، صیغہ کی

پہچان اور نحوی لحاظ سے حل، مگر اس کو آسان کر کے طلبہ کو متوجہ کیا جائے، شرح مائۃ عامل کی ترکیب کا انداز نہ اختیار کیا جائے۔ طلبہ کے پاس ''بیاض والا قرآن'' ہونا چاہیے۔ ہم طلباء کو کہیں گے کہ آپ کے پاس پنسل ہونی چاہیے، اور جب آپ صبح سبق میں آئیں گے تو مفردات اور صیغوں کو حل کر کے آئیں گے۔ نحوی لحاظ سے حل کرانے میں اگر صرف وجہ اعراب طلبہ کو واضح ہوجائے تو کفایت ہوجائے گی، (یہ کم از کم بات ہے)، یعنی یہاں رفع کیوں پڑھ رہے ہیں؟ نصب کس نے دیا؟ جر کس نے دیا؟۔

اور استاذ کا کام ہے کہ طلبہ کو لغت اور قاموس دیکھنے پر پابند کرے، اس لیے کہ وہ کیسا طالبِ علم ہے جو مطالعہ کے بغیر آجائے؟! اور وہ کیسا طالبِ علم ہے جس کے پاس ''لغت'' اور ''قاموس'' نہ ہو؟! طلبہ پر تھوڑا بوجھ ڈالا جائے اور کام کرنے پر حوصلہ افزائی کی جائے۔

حلِ مفردات کے لیے معاون کتب

بنیادی چیز تو لغت ہے، ''مصباحُ اللغات'' اور دیگر بہت ساری ''قوامیس'' ہیں، اور ''مفرداتُ القرآن'' پر بھی مستقل کتابیں ہیں، مولانا محمد عبدالرشید نعمانی صاحب کی کتاب ہے، مولانا عبدالرشید گجراتی کی بھی ایک کتاب اسی نام سے ہے، مولانا نسیم بارہ بنکوی کی ''منتخب لغات القرآن'' دارالہدیٰ والوں نے چھاپی ہے، اس میں طلباء کو بہت آسانی ہے، کیوں کہ عام طور پر ''مصباحُ اللغات'' وغیرہ میں حروفِ اصلیہ کے لحاظ سے ڈھونڈنا پڑتا ہے، اگر درجہ ثانیہ کا طالبِ علم صرف میں کمزور ہے اور حروفِ اصلیہ کے لحاظ سے ''مصباحُ اللغات'' سے استفادہ نہیں کر پا رہا، تو یہ 'منتخب لغات القرآن'' قرآن کی ترتیب پر ہے۔

ایک مفید کتاب شامی عالم محی الدین درویش (متوفی: ۱۹۸۲ء) کی ''إعراب القرآن الکریم'' ہے، اس پر محقق نے چار پانچ صفحات میں مقدمہ خوب لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک پڑھنے والے کو اعراب یعنی ترکیب کا پتہ ہونا کیوں ضروری ہے؟ نصوص کی روشنی میں بہت اچھا سمجھایا ہے۔

ایک اور مفید کتاب مولانا نعمت اللہ اعظمی کی ''نِعم البیان'' ہے، پتہ نہیں چھپی ہے یا نہیں؟ میرے پاس پچھلے دنوں اس کا پی ڈی ایف آیا ہے، وہ شاید ناقص بھی ہے، سورۂ قٓ سے ترجمہ وتفسیر ہے، لیکن اس کا مقدمہ بہت جان دار اور فوائد پر مشتمل ہے۔ ''حروفِ عاطفہ''، ''حروفِ استفہام''، ''بَلٰی''، ''کَلَّا''، ان کا ہم ایک ہی ترجمہ کر رہے ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہے، اُس کتاب میں لکھا ہے: ''بَلٰی'' کا ترجمہ ہمیشہ ''بلکہ'' سے نہیں ہوگا، اور ''کَلَّا'' کا ترجمہ ہمیشہ ''ہرگز'' سے نہیں ہوگا، پھر اس کی بہت ساری مثالیں دیں ہیں، ان میں یہ مثال بھی ہے: ''کَلَّآ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى''، تو مفردات کے حل میں یہ ساری باتیں آئیں گی۔

مفردات کے ذیل میں ایک اہم بحث: قسم اور جوابِ قسم کی ہے

ایک اور بات جو درجہ ثانیہ میں بہت پیش آتی ہے، وہ ہے ’’قسم اور جوابِ قسم‘‘، درجہ ثانیہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ’’عم پارے‘‘ میں جملہ قسمیہ بہت ہیں، اور عام طور وفاق کے سوال میں ایک سوال: قسم اور جوابِ قسم کا ضرور آجاتا ہے کہ جوابِ قسم متعین کریں، تو اس لیے مفردات ہی کے ذیل میں یہ کام بھی بہت ضروری ہے۔ پہلے ہمیں بہت اچھی طرح قسم کی بحث نحو کی کتابوں میں دیکھ لینی چاہیے، ’’هدايةُ النحو‘‘ کو اساس بنائیں، لیکن ’’هدايةُ النحو‘‘ پر اکتفانہ کریں، اگر ہم ’’النحو الوافي‘‘ یا ابنِ ہشام کی ’’شذورُ الذهب‘‘ دیکھ لیں گے تو ہمیں قسم کی بحث سمجھ میں آجائے گی، اس میں تین باتیں اہم ہیں: ایک ’’اداتِ قسم‘‘ ہے، دوسرا ’’مقسم بہ‘‘ یا ’’مقسم بہا‘‘ ہے، اور تیسرا ’’مقسم علیہ‘‘ یا ’’جوابِ قسم‘‘ ہے، ’’وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا‘‘، یہاں واؤ ’’اداتِ قسم‘‘ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے قسم کس کی کھائی؟ یہ ’’مقسم بہ‘‘ یا ’’مقسم بہا‘‘ بنے گا، پھر اس کو سمجھانا کہ ’’نٰزِعٰت‘‘ سے باری تعالیٰ کی کیا مراد ہے؟ ’’تِیْن‘‘ کی قسم باری تعالیٰ نے کیوں کھائی؟ ’’عٰدِیٰت‘‘، گھوڑوں کی قسم کیوں کھارہے ہیں؟ یہ سب سمجھانا ضروری ہے، یہ ’’مقسم بہا‘‘ ہے، پھر جب میں نے قسم کھائی تو اس کا کوئی نہ کوئی ’’جوابِ قسم‘‘ ہوگا، تو باری تعالیٰ بھی کسی بات پر قسم کھاتے ہیں، جس بات پر باری تعالیٰ قسم کھائیں گے وہ ’’جوابِ قسم‘‘ ہوگا، بعض مرتبہ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ’’جوابِ قسم‘‘ کہیں دور ہوجاتا ہے تو طلباء کو متعین کرکے بتانا کہ دیکھو ’’جوابِ قسم‘‘ یہ آرہا ہے۔

④ ترجمۂ قرآن حل کرنے کے ساتھ ساتھ مختصر تفسیر

اگلا مرحلہ تفسیر کا ہے، میں نے عرض کیا کہ اصل تو ترجمۂ قرآن ہے، لیکن چوں کہ تفسیر بیان کی جاتی ہے اور بیان کرنی بھی چاہیے، کیوں کہ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ اگر ہم ’’تفسیرِ جلالین‘‘ کا انتظار کریں اور ان تین یا چار سالوں میں ہم صرف ترجمہ پر اکتفا کرائیں تو اشکال یہ ہوتا ہے کہ ’’تفسیرِ جلالین‘‘ کی اپنی مقدرات کو سمجھائیں یا تفسیر کریں؟ اسی میں فارغ نہیں ہوتے اور ’’تفسیرِ بیضاوی‘‘ تو پاؤ پارہ ہے، تو تفسیر بایں معنی کہ قرآنِ پاک سمجھ میں آئے، یہ کب ہوگا؟ پھر ایک اشکال یہ ہوتا ہے جو آپ حضرات کے ذہنوں میں بھی آتا ہوگا کہ بعض دفعہ وفاق کے پرچوں میں بھی تفسیری سوال آجاتا ہے تو تفسیر بتائیں لیکن مختصر۔

اب مختصر کیسے کریں گے؟ تو اس میں چند باتیں میں مشورۃً عرض کررہا ہوں، آپ حضرات اس کو بہتر انداز سے کررہے ہوں گے۔

سب سے اہم بنیاد باری تعالیٰ کی مراد کا واضح ہوجانا

تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ باری تعالیٰ مجھ سے مخاطب ہیں، باری تعالیٰ کی بات مجھے سمجھ میں آنی چاہیے،

اب اس کو آپ مزید کھولتے چلے جائیں، اس کے ذیل میں ربط کی بات بھی آئے گی، جو ایک الگ موضوع ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض مرتبہ ربط واضح نہ ہوگا تو طلبہ کو بتانا ہوگا کہ کلام تو مربوط ہے، مگر ہماری سمجھ ناقص ہے۔

شانِ نزول کہاں بیان کرنا چاہیے؟

شانِ نزول کے بارے میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے، ''الفوزُ الکبیر'' میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: بعض اسبابِ نزول ایسے ہیں کہ ان کے بغیر آیات ہی سمجھ نہیں آئیں گی، وہاں تو بیان کرنا ضروری ہے اور وہ واقعی سببِ نزول ہے، اور وہی واقعہ ان آیات کے نزول کا سبب بنا ہے، جیسے سورۂ مائدہ کے آخر میں ''يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ الخ'' لیکن بعض جگہ پر تفاسیر میں سببِ نزول لکھا تو ہے اور احادیث میں ''نزلت في كذا'' وارد ہوگا، مگر ضروری نہیں کہ وہ آیت فلاں قصہ ہی پر نازل ہوئی ہو، بلکہ بسا اوقات صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قصہ پیش آیا تو اس کو آیت کا حوالہ دیا گیا، آیت تو پہلے نازل ہو چکی، مگر صحابی رضی اللہ عنہ اس کو اپنے حق میں سمجھ کر نقل کرتا ہے۔

تفسیر کے ذیل میں ایمانی اور نظریاتی تربیت

تدریس میں رخ ایسا بن گیا ہے کہ امتحانی مقامات پر تو توجہ زیادہ ہوتی ہے، مگر وہ جگہیں خصوصاً قرآن کریم میں جو شاید مشکل تو نہ ہوں، مگر شخصی و ایمانی تربیت کے لحاظ سے اہم ہوں، اس پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ ہم نے درجہ خامسہ کا ترجمہ حضرت مولانا عبدالقیوم چترالی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ ہمارے بنوری ٹاؤن کے ناظمِ تعلیمات بھی تھے۔ اس زمانے میں درجہ خامسہ میں آخر کے دس پارے تھے، ''سورۂ عنکبوت'' سے سبق شروع ہوا، مجھے یاد ہے کہ ''أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْا أَنْ يَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ'' میں بہت وقت لگایا، پھر ''سورۂ روم'' آئی تو ''سورۂ روم'' میں یہ جو رکوع ہے: ''وَمِنْ آيَاتِهٖ أَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ''، ''وَمِنْ آيَاتِهٖ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ'' اس کو عام فہم انداز میں بہت دیر سمجھایا۔

میں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''میری علمی اور مطالعاتی زندگی'' کا پہلے حوالہ دیا، اس میں انہوں نے ایک بات لکھی: ''ہمارے ایک استاذ تھے، عرب تھے، وہ ہمیں قرآن پڑھاتے تھے، روتے بھی تھے، رُلاتے بھی تھے۔'' پھر لکھا: ''مجھے توحید اس وقت سمجھ میں آئی جب انہوں نے ہمیں ''سورۂ زمر'' پڑھائی'' ہم میں سے کون سورۂ زمر کو اس انداز سے پڑھاتا ہے، ہم تو اس کو بہت آسان لے لیتے ہیں۔

میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ قرآن ہمیں اس انداز سے پڑھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام، اللہ کرے کہ مجھے سمجھ میں آجائے اور میں اس طرح پڑھاؤں کہ طلباء کو سمجھ میں آجائے۔ قرآنی قصص بھی تو اسی لیے ہیں، یوں ہی تو قرآن نے نہیں کہا: ''لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ''، ''وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ

الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ''، سورۂ شعراء اور سورۂ ہود میں تکرار ہے، یہ تکرار اس لیے نہیں ہے کہ ہم سبق جلدی سے نمٹا دیں، بلکہ نہیں، باری تعالیٰ کچھ بتانا چاہ رہے ہیں۔

اس پر تفاسیر کے بارے میں پہلے چار یا پانچ تفاسیر کا نام حضرت بنوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے حوالے سے عرض کر دیا، اس کے علاوہ ''معارفُ القرآن'' (مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی، دونوں) ''تفسیرِ عثمانی''، ''أیسر التفاسیر'' ابوبکر جابر جزائریؒ کی اور امام ابن جوزیؒ کی ''زادُ المسیر'' سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، ''زادُ المسیر'' میں ارشادی پہلو بہت ملیں گے۔

⑤ قرآن پاک کا بلاغی پہلو بھی ہمیں معلوم ہونا چاہیے

ایک اہم بات میں صرف گوش گزار کر رہا ہوں، درجہ ثانیہ، درجہ ثالثہ بلکہ شاید درجہ رابعہ میں تو بتانے کی نہیں ہے، شاید درجہ خامسہ میں بتانے کی ضرورت پڑے، لیکن میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ مدرس کو پوری طرح مسلح ہونا چاہیے اور کبھی کبھار ہمیں طلبہ کو بھی متوجہ کرنا چاہیے، وہ ہے قرآنِ پاک کا بلاغی پہلو۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ علم تفسیر کے مقدمہ میں ایک عنوان ''اعجاز القرآن'' کا آتا ہے، جس کے ذیل میں قرآن کے وجوہِ اعجاز کا بیان بھی آتا ہے، تو قرآن پاک کے اعجاز و بلاغی پہلو کو بھی آشکارا کرنا چاہیے، اس کے لیے استاذِ محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی دامت برکاتہم نے ہماری رہنمائی ابن عاشور کی ''التحریر والتنویر'' کی طرف کی۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہ مباحث ملیں گے۔

⑥ طلبا کو توجہ دلانے کے لیے سبق سننے/ دہروانے کا اہتمام ہونا چاہیے

ایک بات یہ ہے کہ سبق سننے کا اہتمام ہو، منتہی درجات کی طرح صرف تقریر کر لینے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ ان درجات کے طلبہ کو اگلے دن ضرور پچھلا سننا ہوگا، یہ کام دراصل خود مدرس کے لیے بھی کٹھن ہے۔

سبق سے پہلے ناظرہ خواں طلبا سے قرآنِ پاک پڑھوانے کا اہتمام کریں

ایک بات یہ محسوس ہوئی جب میرے ذمہ درجہ ثالثہ کا ترجمہ لگا کہ جیسے عام درس میں طلبہ سے ہم عبارت پڑھواتے ہیں، ایسے ہی طلبہ سے قرآن کریم کی تلاوت بھی کروائیں، خصوصاً جو طلبہ حافظ نہ ہوں ان سے ضرور پڑھوائیں، بعض مرتبہ ان کی تلاوت لحنِ جلی پر مشتمل ہوتی ہے۔

بس میں اسی پر اپنی بات ختم کروں گا، اللہ تعالیٰ اس مجلس کو قبول فرمائے، ہمارے اکابر و اساتذہ جنہوں نے ہماری تربیت کے لیے اس اجتماع کا انعقاد کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، اور اللہ تعالیٰ اس مجلس کو قبول فرما کر ہم سب کی اور ہمارے والدین کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....